ڈاکٹر محمد فاروق خان

امت مسلمہ کے اہم مسائل اور ان کا حل

یہ دنیا ہمیشہ ملکوں میں بٹی رہی ہے۔ تہذیب وتمدن کے مختلف ادوار میں کسی بھی ملک کے اندرونی استحکام کی کچھ بنیادیں ہوتی ہیں۔ آج دنیا جس مقام پر ہے، اس میں کسی ملک کے استحکام کا دارومدار دو عوامل پر ہے۔ ان میں سے ایک عامل ملک کے اندر چند بنیادی انسانی اساسات کی موجودگی ہے اور دوسرا عامل سائنس اور ٹیکنالوجی میں ایک مضبوط حیثیت حاصل کرنا ہے۔ جس ملک میں یہ دونوں عوامل معیار اور کمال سے قریب تر ہوں گے، اتنا ہی وہ ملک توانا، مضبوط اور خوش حال ہوگا، بیرونی جارحیت سے بہتر طور پر نبرد آزما ہو سکے گا اور قوموں کی برادری میں باوقار و باعزت مرتبے پر فائز ہوگا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بنیادی انسانی اساسات

دس بنیادی اساسات ایسی ہیں جن کی کسی معاشرے میں موجودگی اس کی بقا و نمو کی ضامن ہے۔ ان میں سے پہلی اساس عصبیت ہے۔ یعنی اپنے معاشرے کے ساتھ یک جہتی و یکتائی کا مضبوط احساس۔ یہ احساس ہر فرد میں اس حد تک جاگزیں ہونا چاہیے کہ وہ اجتماعی مفاد کو اپنے مفاد پر ترجیح دے۔ یہ جذبہ اخوت وشجاعت کو جنم دیتا ہے۔ اسی اساس کی وجہ سے ایک انسان اپنے ملک وقوم کے لیے قربانی دیتا ہے اور بہادری کی داستان رقم کرتا ہے۔ یہی جذبہ انسان کے اندر وفاداری کو پروان چڑھاتا ہے اور پھر انسان اپنے ملک کے وسیع تر مفادات کے لیے ہر قسم کی قربانی کو فخر وانبساط کے ساتھ انجام دیتا ہے۔

دوسری اساس مساوات انسانی اور جمہوری کلچر ہے۔ یعنی یہ کہ تمام انسان اصلاً اپنے حقوق میں برابر ہیں۔ کسی کو کسی پر کوئی مستقل فضیلت حاصل نہیں یہی قدر جمہوریت، حریت فکر اور عزت نفس کو جنم دیتی ہے۔ اس کی وجہ سے ہر شہری اپنے آپ کو امور مملکت میں پورا دخیل اور ذمہ دار سمجھتا ہے۔ اسے اپنے وقار اور مقام کا پاس ہوتا ہے اور اس کے اندر خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ مساوات انسانی کے شعور ہی کی وجہ سے ذرائع ابلاغ آزاد ہوتے ہیں اور بڑے سے بڑا فرد بھی کسی دوسرے ادارے کو دباؤ میں نہیں لا سکتا۔

تیسری اساس امانت و دیانت ہے۔ یعنی یہ کہ معاشرے میں عام طور پر سچائی کا چلن ہو۔ تاجر، صنعت کار، سیاست دان، بیوروکریٹ اور حاکم سچ بولیں اور سچ سنیں۔ ملاوٹ اور دھوکا دہی سے فضا عمومی طور پر پاک ہو۔ جھوٹ سے سب لوگ نفرت کریں۔ ہر ایک اپنے وعدے کو پورا کرے۔ پوری سوسائٹی ایک دوسرے پر اعتماد کی فضا میں کھڑی ہو اور ہر فرد اپنی ڈیوٹی بہتر طریقے سے انجام دے۔

چوتھی اساس انصاف ہے۔ یعنی یہ کہ عدالتیں عملاً انصاف فراہم کریں۔ مظلوم کی دادرسی کی جائے۔ انصاف جلد اور سستا ہو۔ پولیس کا اہم ترین فریضہ مجرموں کی سرکوبی اور شریفوں کی اشک شوئی ہو۔ عوام کا عدالتوں پر اعتماد ہو اور عوام کبھی گواہی نہ چھپائیں، بلکہ ہر فرد اس کو اپنی ذمہ داری سمجھے اور وہ سچی گواہی کے ذریعے سے عدالت کی مدد کرے۔ نیز ملک کے ہر طبقے اور ہر اکائی کے ساتھ انصاف کیا جائے۔

پانچویں اساس محنت ہے۔ یعنی یہ کہ ہر فرد اپنے کام سے محبت کرے۔ محنت کو عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے اور سستی و کاہلی سے نفرت کی جائے۔ ہر پیشہ معزز سمجھا جائے اور ہر فرد کسی نہ کسی مثبت سرگرمی میں مصروف ہو۔ یہی اساس تعلیم کی اہمیت کو بھی نمایاں کرتی ہے۔

چھٹی اساس معیار ہے۔ یعنی یہ کہ فرد کو قابلیت و صلاحیت کی بنیاد پر جانچا جائے۔ رشوت اور ناجائز سفارش ناقابل تصور ہو۔ قابلیت کو پس پشت ڈال کر کسی اور دباؤ کی بنیاد پر ترجیح دینا بہت بڑی غلطی سمجھا جائے۔ ہر معاہدے کی روح و معانی کے ساتھ پابندی کی جائے۔

ساتویں اساس ملک کے قانون کی پابندی ہے۔ یعنی یہ کہ ہر فرد و ادارہ ملکی قانون کو ہر چیز پر بالادست سمجھے۔ ہر انسان ہر وقت یہ خیال رکھے کہ اس سے قانون کی خلاف ورزی سرزد نہ ہو۔ بڑے سے بڑا انسان بھی اپنے آپ کو قانون کا ماتحت اور اس کے سامنے جواب دہ سمجھے۔ اس سے ہر شہری قانون کو ہر وقت اپنی پشت پر محسوس کرتا ہے اور اسے اعتماد ہوتا ہے کہ قانون کی پابندی کی صورت میں معاشرے کی ہر قوت اور ہر ادارہ اس کی مدد کرے گا اور قانون شکنوں کے خلاف تمام ادارے اور عوام ہر وقت متحد ہوں گے۔

آٹھویں بنیاد محروم و کمزور طبقات کی مدد کرنے کے لیے کمربستہ رہنا ہے۔ ہر سوسائٹی میں زیردست اور مفلوک الحال افراد و طبقات ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ جن افراد کے پاس وسائل کی فراوانی ہے، وہ محروم طبقات کی مدد کو اپنا فرض سمجھیں اور اس مقصد کے لیے وسائل اور قوت کی قربانی دیں۔

نویں بنیاد تدبر اور حکمت و دانش ہے۔ یعنی یہ کہ ہر قومی، اجتماعی یا انفرادی معاملے کو جذبات و اشتعال کی نظر سے دیکھنے اور اس پر فوری ردعمل ظاہر کرنے کے بجائے اس کا پورا تجزیہ کیا جائے۔ تحمل، رواداری اور شایستگی کو اپنا مزاج بنایا جائے اور باہمی مکالمے اور ٹھنڈے غوروفکر کے بعد ہر مسئلے کا حل نکالا جائے۔ جب ہر فرد اس قدر پر عمل پیرا ہوتا ہے تو اس سے غلطی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کا امکان کم ہوتا ہے۔ اور جب کوئی ریاست اپنے داخلی و خارجی مسائل کے حل کے لیے اس پر عمل پیرا ہوتی ہے تو اقوام کی برادری میں اسے ایک قابل عزت اور باوقار مقام حاصل ہوتا ہے۔

دسویں بنیاد صبر و استقامت ہے۔ ہر فرد اور قوم کو اپنی زندگی میں بہت سی مشکلات پیش آتی ہے۔ ایسے مواقع پر جلد بازی، زود رنجی اور سطحی اثرات کے تحت فیصلے تبدیل کرنے کا رویہ انتہائی نقصان دہ ہوسکتا ہے۔ تمام تکالیف کو صبر و استقامت کے ساتھ برداشت کرنا، سچی بات پر ڈٹے رہنا، اگر جھوٹ وقتی فائدہ دے تب بھی اس سے اجتناب کرنا، اپنے اعلیٰ مقاصد اور اخلاقیات کے لیے ہر مشکل خندہ پیشانی سے سہنا، ہر فرد اور ہر قوم کی حقیقی کامیابی کے لیے انتہائی ضروری ہیں۔

سائنس اور ٹیکنالوجی میں مضبوط حیثیت

خوب سے خوب تر کی تلاش اور مسلسل ترقی کرنے کی خواہش انسان کی سرشت میں ودیعت کی گئی ہے۔ جو قومیں اس فطری داعیے کی پاس داری اور آب یاری کریں، وہ ہمہ وقت آگے بھی بڑھتی ہیں اور انسانیت کو فائدہ بھی پہنچاتی ہیں۔ اس کے برعکس جو قومیں اس سے غفلت برتیں، ان کے لیے زندہ رہنے کے مواقع کم سے کم تر ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اگر وہ زندہ رہتی ہیں تو دوسروں کے رحم و کرم پر۔ وہ اپنی نظر میں بھی زندہ، خوددار اور باوقار نہیں رہتیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے عمومی تعلیم سب کے لیے اور اعلیٰ تعلیم کے دروازے سب باصلاحیت افراد کے لیے کھلے ہونے چاہییں۔ معاشرے میں سب سے زیادہ عزت، تعلیم، تحقیق، دریافت اور اس سے وابستہ افراد کی ہونی چاہیے۔ سائنس اور ٹیکنالوجی بیرونی جارحیت کے خلاف سب سے بڑی رکاوٹ ہے اور اس کی بنیاد پر دوسری اقوام سے باوقار معاملہ کیا جا سکتا ہے۔ گویا جو قوم اس دنیا میں جینا چاہتی ہے، اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ صنعتی، زرعی، طبی، دفاعی، غرض یہ کہ ہر میدان میں جدید ترین علم پر دسترس حاصل کرے۔ اس کے بغیر اس کے لیے اپنی آزادی کو حقیقی معنوں میں برقرار رکھنا ممکن نہ ہوگا۔

اسلام کی تعلیمات

اسلام نے درج بالا دونوں عوامل کو پوری اہمیت دی ہے۔ قرآن مجید میں ان سب امور کے متعلق واضح ہدایات آئی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی بھی ان اقدار کی واضح تصویر ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ قرآن مجید نے مزید ان اقدار پر بھی زور دیا ہے جن سے ایک ملک کا اسلامی تشخص پوری طرح نمایاں ہو جاتا ہے۔ وہ اقدار توحید کی بنیاد پر سوسائٹی کو استوار کرنا، نماز کو فروغ دینا، ٹیکس کی تحدید کرنا، حیا کو عام کرنا اور خاندانی نظام کا تحفظ ہیں۔ تاہم بین الاقوامی تعلقات کے ضمن میں جس قدر پر زور دیا گیا ہے، وہ یہ ہے کہ دوسرے ملکوں کے ساتھ بھی خالصتاً انصاف کی بنیاد پر معاملہ کیا جائے۔ اور اگر اس سے اپنے ملکی مفادات کو نقصان پہنچتا ہے تو اسے گوارا کر لیا جائے، لیکن بین الاقوامی معاملات میں کسی بے انصافی کا شائبہ بھی نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

”ایمان والو! عدل پر قائم رہنے والے بنو۔ اللہ کے لیے شہادت دیتے ہوئے اور کسی دوسری قوم کی دشمنی تمھیں اس طرح نہ ابھارے کہ تم عدل سے پھر جاؤ۔ عدل کرو۔ یہ تقویٰ سے زیادہ قریب تر ہے۔“ (المائدہ ۵: ۸)

قوموں کی ایک دوسرے پر تفوق کی خواہش

ہر انسان کے اندر یہ داعیہ موجود ہے کہ وہ ہر معاملے میں مسلسل ارتقا کے راستے پر گام زن رہے۔ یہ داعیہ انسان کی ترقی کے لیے نہایت ضروری ہے۔ انسان کی آج تک کی تمام ترقی اسی داعیہ کی مرہون منت ہے۔ اسی طرح انسانوں کے کسی بھی گروہ یعنی ملک وقوم کے اندر بھی یہ داعیہ پایا جاتا ہے۔ اگر انسانوں کی طرح قوموں کے اندر بھی یہ داعیہ مثبت انداز میں موجود رہے تو یہ بلحاظ مجموعی انسانیت کی ترقی کے لیے نہایت مفید ثابت ہوتا ہے۔ قومیں اسی طرح ایک دوسرے سے سیکھتی ہیں اور ایک دوسرے کی ترقی میں مدومعاون ثابت ہوتی ہیں۔

تاہم جس طرح ایک انسان اپنے اندر کسی بھی مثبت داعیے کو ضبط وتوازن کے ساتھ استعمال کرنے کے بجائے جب اسے شتر بے مہار کی طرح بے لگام چھوڑ دیتا ہے تو اس سے گوناگوں خرابیاں جنم لیتی ہیں اور اس کے نقصانات معاشرے کے ساتھ اس انسان پر بھی مرتب ہوتے ہیں۔ یہی معاملہ ایک قوم کا بھی ہے۔ جب اس کی ترقی پانے کی خواہش بے لگام ہو جاتی ہے تو اس کے اندر دوسری قوموں کو تسخیر کرنے اور ان پر تفوق پانے کی خواہش جنم لیتی ہے۔ دنیا بھر کی اکثر جنگوں کے پیچھے زیادہ تر یہی جذبہ وخواہش کارفرما رہی ہے۔

دوسری قوموں پر تفوق حاصل کرنے کا جذبہ ہر زمانے میں اپنے مختلف انداز رکھتا ہے۔ جب دنیا میں بادشاہت کا دور دورہ تھا، اس وقت یہ ممکن تھا کہ مختلف قوموں کو طاقت کے زور پر زیر نگیں رکھا جائے۔ اب جمہوری دور اور جمہوری ممالک میں یہ ممکن نہیں رہا اس لیے اب تہذیبی تفوق کو سب سے بڑی ترجیح حاصل ہو گئی ہے۔ اب مختلف ملک اور گروہ مسلسل اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ ان کی تہذیب وتمدن دوسروں کے ہاں بھی غالب حیثیت اختیار کر جائے۔

جذبۂ تفوق کے خلاف قدرتی رکاوٹیں

انسانوں اور گروہوں کے اندر دوسروں کو تسخیر کرنے کی خواہش بسا اوقات اتنی شدت اختیار کر جاتی ہے اور ان گروہوں کو اتنی دنیوی طاقت حاصل ہو جاتی ہے کہ واضح طور پر یہ خطرہ نظر آنے لگتا ہے کہ کہیں وہ پوری دنیا کو اپنا غلام نہ بنا لیں، دنیا کے اندر سے تمام اچھی اقدار ختم نہ کر دیں اور دنیا کا امن تہ وبالا نہ کر دیں، لیکن یہ بڑی عجیب حقیقت ہے کہ دنیا کے اندر پوری تاریخ میں ایسے گروہوں کو کبھی مستقل بالادستی حاصل نہیں ہوئی۔ اس کے برعکس انھی قوتوں کے اندر سے ہمیشہ ایسے تضادات جنم لیتے ہیں جس کی وجہ سے یہ طاقتیں کچھ ہی عرصہ بعد اپنی قوت وبالادستی کھو دیتی ہیں اور انسانیت بحیثیت مجموعی ترقی اور بہتر اقدار کی طرف اپنا سفر جاری رکھتی ہے۔ تاریخ سے بلا کسی استثناء کے ہمیں یہی سبق ملتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قوموں کے جذبۂ تفوق کے خلاف پروردگار کا طریقہ

قرآن مجید کے مطابق پروردگار اس دنیا کی زندگی میں برائی کی طاقتوں کو اس حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتا جہاں ان کی وجہ سے نیکی کے وجود کے مٹ جانے کا اندیشہ پیدا ہو جائے۔ اگر انسانیت اور نیکی کی بنیادی اقدار کے خلاف اٹھنے والی طاقتیں ایک حد سے زیادہ قوت پکڑ لیں تو پروردگار اپنے براہ راست فیصلے کے تحت اس کوشش کو ناکام بنا دیتا ہے۔ یہ اس لیے ضروری ہے کہ انسانیت کی بقا اچھی اقدار میں پوشیدہ ہے۔ یہاں بدی کو اتنا طاقت ور نہیں ہونا چاہیے جس سے وہ نیکی کو ہڑپ کر جائے۔ ارشادی ربانی ہے:

''اگر اللہ بعض لوگوں کو بعض (دوسرے) لوگوں کے ذریعے سے دفع نہ کرتا تو زمین میں فساد پھیل جاتا۔ مگر اللہ دنیا والوں پر بڑا فضل و کرم کرنے والا ہے۔'' (البقرہ ۲:۲۵۱)

فرد اور قوم کے انجام میں فرق

ایک فرد کے لیے دنیا کی یہ زندگی دراصل ایک آزمایش ہے اور اس کا حقیقی نتیجہ آخرت ہی میں ظاہر ہو گا۔ یہ عین ممکن ہے کہ اس دنیا میں کسی اچھے انسان کو اس کی اچھائی کا کوئی صلہ نہ ملے یا کسی برے انسان کو اس کی برائی کی کوئی سزا نہ ملے۔ لیکن قوموں کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ چونکہ کوئی قوم، بحیثیت قوم آخرت میں جواب دہ نہیں، اس لیے قوموں کو اپنے اجتماعی اعمال و کردار کا اچھا یا برا نتیجہ اسی دنیا میں مل جاتا ہے۔ اگر وہ ان دو بنیادی عوامل پر عمل پیرا رہے جن کا تذکرہ اس تحریر کے شروع میں ہو چکا ہے تو اسے ایک لمبی مدت تک دنیا میں ایک مضبوط قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کا موقع مل جاتا ہے۔ جو قوم ان اقدار پر عمل کرنے میں کوتاہی برتتی ہے، وہ اتنی ہی کمزور ہوتی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بالکل مغلوب یا غلام بن جائے یا فنا ہو جائے۔

مسلمانوں کے زوال کا بنیادی سبب

یوں تو مسلمان ریاستوں کے اندر ان تمام بنیادی اقدار میں انحطاط آیا ہے جن کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ لیکن اس ضمن میں سب سے بڑی وجہ مسلمان ریاستوں اور اہل علم پر فلسفہ و تصوف کے علوم و افکار کا غلبہ تھا۔ فلسفہ و تصوف دونوں مابعد الطبیعیاتی علوم میں نشے کی وہ تاثیر ہے کہ جب ایک دفعہ کسی فرد یا قوم پر اس کا غلبہ ہو جائے تو وہ زندگی کے حقائق اور دنیوی علوم سے بے گانہ ہو جاتی ہے۔ چنانچہ جب مسلمانوں کے درباروں اور اعلیٰ ترین دماغوں کا اشتغال فلسفہ و تصوف میں بڑھ گیا تو وہ سائنس و ٹیکنالوجی سے غافل ہو گئے۔ عین اسی دور میں اہل یورپ نے اپنی پوری توانائی سائنس اور اس میں خصوصاً مواصلات کے نئے ذرائع دریافت کرنے میں لگا دی۔ اس فرق نے یورپ کو فیصلہ کن برتری دلا دی اور اس کی وجہ سے مسلمان ممالک اب بھی دنیا میں واضح طور پر پیچھے ہیں۔ جب تک اس فرق کو ختم نہیں کیا جائے گا تب تک یہ خواہش کہ مسلمان ممالک باقی ملکوں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کے ہم پلہ بن جائیں، تشنۂ تکمیل رہے گی۔

موجودہ مسلمان ممالک اور ترقی یافتہ ممالک کے درمیان بنیادی فرق

بدلے ہوئے حالات کے نتیجے میں پچھلے پچاس برسوں میں بیشتر مسلمان ممالک آزاد ہوگئے ہیں۔ تاہم اس آزادی کے باوجود وہ ترقی کی دوڑ میں دوسروں سے بہت پیچھے ہیں۔ اس کی چار بنیادی وجوہات ہیں:

پہلی وجہ یہ ہے کہ ابھی تک کسی مسلمان ملک کے ہاں سائنس اور ٹیکنالوجی میں اعلیٰ مقام حاصل کرنا مرکزِ نگاہ نہیں بنا، بلکہ یہ ان کی ترجیحات کے اندر شامل ہی نہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اخلاقیات کے معاملے میں مسلمان معاشرے ترقی یافتہ دنیا سے بہت پیچھے ہیں۔ امانت، دیانت، محنت، وقت کی پابندی، مساوات انسانی، حریت، صفائی جیسی صفات میں مسلمان دوسروں سے بہت پیچھے ہیں۔ اس کے برعکس اجتماعی برائیوں مثلاً جھوٹ، دھوکا، خیانت، رشوت، ملاوٹ، چور بازاری، بدعہدی، مبالغہ آمیزی اور سستی و کاہلی میں مسلمان دوسروں سے آگے نظر آتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تیسری وجہ یہ ہے کہ طرز فکر کے معاملے میں بھی مسلمان دوسروں سے پیچھے ہیں۔ ترقی یافتہ معاشروں میں مکالمے، دلیل، تجزیہ، قائل کرنے اور قائل ہونے، عقلی سوچ، تحمل اور برداشت عام معاشرتی رویے ہیں۔ اس کے برعکس مسلمان معاشروں کے فکر و عمل کی نفسیات اشتعال انگیزی، انتقام، جذباتیت اور طاقت کی بنیاد پر ہر مسئلہ حل کرنے سے عبارت ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ مسلمان اپنی زبوں حالی اور کمزوریوں کا تجزیہ خود اپنے اندر کرنے کے بجائے، اس وہم کا شکار ہو گئے ہیں کہ ان کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں۔ ہر معاملے میں دوسروں کو مطعون کرنے، دوسروں کو الزامات دینے اور اپنی مصیبتوں کے لیے دوسروں کو ذمہ دار ٹھہرانے کی نفسیات مسلمانوں کی رگ وپے میں سرایت کر چکی ہے۔ یہ توہم پرستی (Paranoid Thinking) دراصل حقائق سے فرار ہے۔ یہ اس لیے ہے تاکہ اپنی خامیوں کی طرف دھیان نہ جائے۔ کیونکہ دھیان جائے گا تو اس کا حل بھی ڈھونڈنا پڑے گا۔ اور پھر اس حل کو حاصل کرنے کے لیے کچھ تگ و دو بھی کرنی پڑے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک مشکل کام ہے۔ کون اتنے پاپڑ بیلے۔ اس کے بجائے آسان کام یہی ہے کہ ماتمی اور فریادی رویہ اختیار کر کے کہا جائے کہ ہمارے دکھوں کے ذمہ دار دوسرے ہیں۔

مغرب کا موجودہ رویہ

ہمارے لیے یہ سوال بھی اہم ہے کہ ہم یہ تجزیہ کریں کہ عالم اسلام کے حوالے سے مغرب اور دوسری غیر مسلم دنیا کیا چاہتی ہے؟

اس وقت مغرب میں اسلام اور مسلم دنیا سے متعلق تین رویے موجود ہیں۔ ایک رویہ دشمنی کا ہے۔ یہ طبقہ اسلام کو مغرب

دشمنی کا علم بردار گردانتا ہے۔ اس ذہنیت کے خیال میں مغرب کی نجات صرف اس میں ہے کہ مسلمانوں کو مکمل شکست سے دوچار کیا جائے اور مسلم دنیا کے اندر وہی قیادت ابھاری جائے جو آنکھیں بند کر کے مغربی اقدار کی تقلید پر یقین رکھے۔ یہ طبقہ اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کسی بھی پروپیگنڈے کے موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔

دوسرا طبقہ اسلام دشمن تو نہیں، لیکن یہ مسلمانوں کو بلحاظ مجموعی تاریک خیال، ترقی دشمن، جمہوریت دشمن اور پس ماندہ سمجھتا ہے۔ مغرب کا سیاسی طبقہ یہی ذہنیت رکھتا ہے۔ اس طبقے کے خیال میں مسلمان حکومتوں کو اپنے پنجے کے اندر رکھنا ضروری ہے تاکہ وہ مغرب کے لیے خطرہ نہ بننے پائیں۔ اس کے لیے وہ عام طور پر معاشی و اقتصادی میدان میں مسلمان ممالک کو اپنا دست نگر رکھنا چاہتا ہے۔ مغربی تہذیب اس وقت ایک غالب تہذیب ہے، اس لیے اس تہذیب کی اقدار اور روایات باہمی ارتباط کے نتیجے میں مسلم معاشرے میں دراندازی کرتی جاتی ہیں۔

تیسرا طبقہ مسلم دنیا کے لیے ہمدردانہ ذہنیت رکھتا ہے۔ اس طبقہ کے خیال میں مسلمانوں کو غلط سمجھا گیا ہے۔ وہ اتنے برے نہیں جتنا ذرائع ابلاغ انھیں پیش کرتا ہے۔ اس ضمن میں وہ مغرب کو اس کے تضادات کی طرف بھی توجہ دلاتا ہے۔ مسلم دنیا اور اس کے ساتھ ساتھ تمام پس ماندہ ممالک کے ساتھ روا رکھے جانے والے امتیازی سلوک کو افسوس کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اور سمجھتا ہے کہ اگر مغرب، مسلم دنیا کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے تو مسلمانوں کی طرف سے اسے مثبت جواب ملے گا۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مغرب سے مطلوب رویہ

یہ ممکن نہیں کہ کسی بھی مہم جوئی کے نتیجے میں دنیا کے سو کروڑ مسلمان نیست و نابود ہو جائیں یا ان کی حکومتیں ختم ہو جائیں۔ لامحالہ سب کو ایک ساتھ جینا پڑے گا اور اس کا واحد طریقہ پرامن بقائے باہمی کی بنیاد پر جینا ہے۔ ایسی پالیسیاں جن سے مسلمان معاشرے اقتصادی طور پر اپنے آپ کو مغرب کا دست نگر محسوس کریں، ان کے شکنجے میں کسا ہوا پائیں، مزید ردعمل کا باعث بنتی ہیں۔ ہر ردعمل تلخی، کھنچاؤ اور انتہا پسند تحریکوں کو مہمیز دیتا ہے۔ یہ سب عوامل مل کر غیر یقینی حالات کو جنم دیتے ہیں۔ جس کا نتیجہ مغرب کے لیے بھی خوش گوار ثابت نہیں ہوتا۔

اس لیے مغرب کے لیے صحیح راستہ یہ ہے کہ وہ پس ماندہ مسلمان ممالک کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لیے مثبت اقدامات کرے۔ ہر ایسے کام سے احتراز کرے جس سے مسلمان معاشروں کے اندر منفی ردعمل کا اندیشہ ہو۔ اسے چاہیے کہ عالم اسلام کے معتدل علمی و سیاسی حلقوں کے ساتھ مکالمے پر مبنی پرجوش، مخلصانہ اور آبرومندانہ تعلق اپنائے۔ طویل المیعاد پالیسی کے اعتبار سے یہی صحیح طریقہ ہے۔ اسی سے پوری دنیا کے اندر انسانیت کا ارتقا ہو گا اور ہم ایک محفوظ اور خوش حال تر مستقبل کی طرف بڑھ سکیں گے۔

مسلمانوں کا موجودہ رویہ

مسلم دنیامیں بھی مغرب اور غیر مسلم دنیا کے حوالے سے تین رویے پائے جاتے ہیں۔

ایک رویہ یہ ہے کہ مسلمانوں کا اصل مقصد تمام دنیا پر حکمرانی ہے۔چنانچہ مسلمانوں کا اصل ہدف یہی ہونا چاہیے کہ وہ پوری دنیا کے غیر مسلموں کو اپنے زیرنگیں لے آئیں۔ یہ ذہنیت مغرب کو مجموعۂ شر قرار دیتی ہے۔اس ذہنیت کے خیال میں اسلام اور غیر مسلم دنیا کے مابین ابدی دشمنی ہے۔ یہ انتہا پسندانہ ذہنیت مسلمانوں کے اندر اقلیت میں ہے۔تاہم اس کی مضبوط بنیادیں موجود ہیں۔اسی ذہنیت کو عام طور پر بنیاد پرستی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

دوسرا رویہ مرعوبیت کا ہے۔اس ذہنیت کے خیال میں اصل معیار مغرب ہے۔مغربی اقدار ہی عظیم ترین ہیں۔اس ذہنیت کے علم بردار مسلم دنیا کے بالادست طبقات میں موجود ہیں۔تاہم مجموعی طور پر یہ طبقہ مسلم دنیا کے لیے اجنبی ہے، کیونکہ یہ ان کے اجتماعی ضمیر کے خلاف ہے۔

تیسرا رویہ اعتدال کا ہے۔اس ذہنیت کے خیال میں اگرچہ اسلام اور غیر مسلم دنیا کے درمیان بنیادی تضادات موجود ہیں، تاہم دونوں کے درمیان غلط فہمی کی ایک دیوار بھی موجود ہے جسے دور کیا جاسکتا ہے۔اور اس طرح پر امن بقاے باہمی ممکن ہے۔مسلم دنیا میں یہی طبقہ اکثریت میں ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مسلمانوں سے مطلوب رویہ

یہ نقطۂ نظر کہ مسلمانوں کا اصل مقصد تمام غیر مسلموں کو اپنے زیرنگیں لانا ہے، دینی اعتبار سے غلط اور عملی لحاظ سے ناممکن ہے۔ اسلام تو دعوت کے ذریعے سے پھیلنے والا دین ہے۔اسلام آزادی رائے، جمہوریت اور تمام بنیادی انسانی حقوق کا حامی ہے۔ یہ صرف پیغمبروں اور ان کے ساتھیوں کا مقام و مرتبہ ہوتا ہے کہ وہ مخاطبین پر اتمام حجت کر سکتے ہیں۔اتمام حجت کے بعد نہ ماننے والے والوں پر پروردگار یا تو براہ راست اپنا عذاب نازل کر دیتا ہے یا پیغمبر کے ساتھیوں کے ہاتھوں ان کو سزا دیتا ہے۔ یہ ایک ایسا قانون ہے جو صرف اور صرف رسولوں اور ان کے ساتھیوں کے لیے خاص ہے۔عام مسلمانوں کا اصل کام خیر خواہی کے ساتھ دین کی دعوت پہنچانا ہے۔اور اس سے زیادہ ان کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ چنانچہ یہ لازم ہے کہ مسلمان مکالمے، تحمل، برداشت اور دلیل کی زبان پر یقین رکھیں۔اعلیٰ ترین اخلاقی معیار سے کبھی نیچے نہ اتریں۔ساری دنیا ان کے لیے میدان دعوت ہے۔مسلمانوں کے لیے صحیح رویہ اعتدال سے سمجھنے اور سمجھانے کا ہے۔اسلام کی اصل خدمت بھی یہی ہے اور اسی میں مسلمانوں کے لیے خیر ہے۔

اگر مسلمان یہ نقطۂ نظر رکھیں کہ غیر مسلموں کو زیرنگیں لانا ان کا دینی فریضہ ہے تو پھر مغرب کے خلاف ان کے تمام الزامات کی کوئی حقیقت نہیں رہتی۔ پھر مغرب کے لیے واحد راستہ یہی ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی کو اپنا اولین مقصد قرار

دے۔ اگر مسلمانوں کی کامیابی ان کے لیے غلامی کا پیغام ہے تو پھر ان کے لیے اسلام کی مخالفت کے علاوہ اور کوئی راستہ بچتا ہی نہیں۔ پھر مغرب اسلام کے خلاف جو کچھ کر رہا ہے، بالکل صحیح کر رہا ہے، بلکہ اسے اس سے کہیں زیادہ شدومد سے یہ سب کچھ کرنا چاہیے۔

انسانی ضمیر کسی بھی معاملے میں دہرے معیار کو پسند نہیں کرتا۔ جب ہمارے معاملے میں کوئی اور طاقت دہرا معیار اپناتی ہے تو ہمیں اس سے شکایت پیدا ہوتی ہے۔ جب ایسا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ اسلام دہرے معیار کا حامل ہو۔ حقیقت میں یہ اسلام پر اپنے نادان پیروکاروں کی طرف سے ایک ایسا بہتان ہے جو غیر مسلموں کو آپ سے آپ یہ جواز فراہم کرتا ہے کہ وہ اسلام کی مخالفت کریں۔ اسلام کسی معاملے میں بھی دہرے معیار کا حامل نہیں ہے۔ اسلام جو حق اپنے لیے لینا چاہتا ہے، وہی دوسروں کو بھی دینا چاہتا ہے۔ اس موضوع پر بہت تفصیل کے ساتھ راقم الحروف کی کتاب ''اسلام اور جدید ذہن کے شبہات'' میں روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ عملی اعتبار سے بھی یہ ناممکن ہے کہ مسلمان اپنے سامنے ایسا کوئی مقصد رکھیں۔ اس وقت مسلمان ہر معاملے میں مغرب کے دست نگر ہیں۔ کیا یہ کم عقلی نہیں کہ مغرب ہی سے از کار رفتہ اسلحہ حاصل کر کے ہم ان کے خلاف لاف زنی کرتے پھریں اور انھیں للکارتے پھریں۔ جبکہ ان کے پاس ہم سے کئی گنا اعلیٰ ٹیکنالوجی بھی ہے اور جبکہ ہم اپنا اسلحہ چلانے کے لیے بھی ان کے فاضل پرزوں کے محتاج ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آج اگر عالم اسلام اعلیٰ تعلیم اور ٹیکنالوجی کے حصول کو اپنا مقصد اولین قرار دے تو اسے اسی میدان میں مغرب کے ہم پلہ ہونے کے لیے دہائیاں درکار ہوں گی۔

چنانچہ مسلمانوں کا اصل مقصد اور ٹارگٹ یہ ہونا چاہیے کہ وہ پرامن بقاے باہمی پر یقین کے ذریعے سے غیر مسلم دنیا کے ساتھ مکالمے کو آگے بڑھاتے ہوئے اعلیٰ تعلیم اور سائنسی علوم کے حصول پر اپنی پوری توجہ مرکوز کریں۔ یہی تمام دنیا اور خود اپنے ساتھ مسلمانوں کی خیر خواہی ہے۔

مغرب کی مجبوریاں اور محدودیتیں

یہ شبہ نہیں ہونا چاہیے کہ مغرب مسلمانوں کو سائنس پر کسی طرح بھی دسترس حاصل نہیں کرنے دے گا۔ یہ ممکن نہیں ہے۔ مغربی تہذیب کے اندر ایسی محدودیتیں اور کسی حد تک ایسے تضادات ہیں جن کی بنیاد پر نہ صرف یہ کہ مغرب سائنس اور ٹیکنالوجی کا راستہ نہیں روک سکتا، بلکہ وہ مسلمانوں کے خلاف کوئی معاندانہ کارروائی بھی نہیں کر سکتا۔ بشرطیکہ مسلم ممالک اسے خود یہ موقع فراہم نہ کریں۔

پہلی بات یہ ہے کہ مغربی معاشرے کا سنجیدہ عنصر بلحاظ مجموعی آزادی رائے، انصاف، مکالمے، پرامن بقاے باہمی، جمہوریت اور ضمیر کی آزادی پر یقین رکھتا ہے۔ اس لیے مغربی حکومتیں جب بھی کوئی ایسا کام کرنا چاہیں جو ان بنیادی اقدار سے متصادم ہو تو خود مغرب کے اندر اس کے خلاف ردعمل شروع ہو جاتا ہے۔ اور پھر حکومتوں کے لیے ایک غلط اور پس ماندہ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ممالک کے خلاف بنائی گئی پالیسیوں پر عمل درآمد مشکل ہو جاتا ہے۔حقیقت تو یہ ہے کہ مغرب کی بیدار اور باضمیر رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کر کے ترقی یافتہ ممالک کو کئی غلط اقدامات سے روکا جا سکتا ہے۔

دوسری محدودیت یہ ہے کہ ٹیکنالوجی پر اب کسی ایک ملک کی اجارہ داری نہیں ہے۔ترقی یافتہ ممالک کے درمیان آپس میں بہت مسابقت ہے۔ان میں سے کئی ممالک اس کو ترجیح دیتے ہیں کہ وہ اپنی بعض مصنوعات خود نہ بنائیں، بلکہ پس ماندہ ممالک کے اندر بنائیں۔انھیں اپنے ہاں افرادی قوت کے مسائل ہیں۔انھیں اپنی مصنوعات کی فروخت کے لیے منڈی چاہیے۔ترقی یافتہ ممالک کے آپس میں تزویراتی اور سیاسی اختلافات بھی ہیں۔یہ سب چیزیں ٹیکنالوجی کے بہاؤ کا سبب بنتی ہیں۔

تیسری مجبوری یہ ہے کہ ٹیکنالوجی کی ترقی اب ایک ایسے مقام پر پہنچ گئی ہے کہ جہاں اب معلومات کے بہاؤ کو روکنا کسی کے بس کی بات نہیں۔کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے انقلاب نے اب پس ماندہ ممالک کے لیے معلومات کے دروازے کھول دیے ہیں۔دن بہ دن یہ راستے مزید کھلتے جائیں گے۔اب تو صرف اس بات کی ضرورت ہے کہ حکمت کے ساتھ ان مواقع اور ممکنات سے بھر پور فائدہ اٹھایا جائے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اس بحث کا چوتھا پہلو یہ ہے کہ اقوام متحدہ اور بین الاقوامی سمجھوتوں اور روایات کی وجہ سے اب ملکوں کی سرحدیں بالعموم محفوظ ہو گئی ہیں۔بین الاقوامی اداروں کے اندر کئی منفی چیزیں بھی ہیں، مگر ان کے مثبت پہلو ان پر حاوی ہیں۔ان کا سب سے بڑا مثبت پہلو یہ ہے کہ اگر چھوٹے سے چھوٹا ملک بھی اپنے آپ کو اندرونی اور بیرونی تضادات سے محفوظ رکھے تو اس کی سرحدیں محفوظ رہتی ہیں اور بڑے سے بڑا ملک بھی اس کے اوپر حملہ کرنے کی جرأت نہیں کرتا۔اس سے چھوٹی قوموں کو یہ سہولت مل گئی ہے کہ وہ دفاع کے بجائے تعلیم کی طرف زیادہ وسائل منتقل کریں اور یوں اس موقع سے فائدہ اٹھائیں۔ گویا آج اگر کوئی ملک حکمت کے ساتھ جینا چاہے تو اس کے لیے ترقی کے تمام دروازے کھلے ہیں۔

کیا یہودی و عیسائی مسلمانوں کے مستقل دشمن ہیں؟

قرآن مجید کی چند آیات سے عام طور پر یہ بات اخذ کی جاتی ہے کہ اسلام کی ہدایت کے مطابق یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست بنانا ہمیشہ کے لیے ممنوع ہے۔انفرادی طور پر بھی اور قومی طور پر بھی۔

ہمارے نزدیک قرآن مجید کی ان آیات سے یہ اصول نہیں نکلتا۔اس کے برعکس ان آیات کا ایک خاص پس منظر ہے جس کو جب صحیح تناظر میں دیکھا جائے تب اصل بات سمجھ میں آتی ہے۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم ایک ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے مدینہ تشریف لے گئے تو وہاں یہود و نصاریٰ بھی ان کے مخاطب بن گئے۔کیونکہ وہ وہاں بستے تھے اور حضور نے ان کو براہ راست پروردگار کا پیغام پہنچانا

شروع کیا۔ان کے لیے پروردگار کا پیغام یہ تھا کہ وہ اس رسول پر ایمان لے آئیں۔ اور اگر وہ ایمان نہیں لائیں گے تو اتمام حجت کے بعد ان پر پروردگار کی طرف سے اس دنیا میں سزا نازل ہوگی۔ یہی پیغام مکہ میں مشرکین کو دیا گیا تھا۔ مدینہ میں حضور نے یہودیوں سے معاہدہ کیا جسے ''میثاق مدینہ'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اس معاہدے کی رو سے یہودیوں نے حضور کو ریاست مدینہ کا سربراہ مان لیا۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ ان میں سے سلیم الفطرت لوگ مسلمان ہوتے گئے۔ چنانچہ قرآن مجید نے مختلف مقامات میں یہود و نصاریٰ کے ان تمام طبقات کا تجزیہ کیا۔ ان کو مخاطب کیا اور تاریخ سے مثالیں دے کر انھیں سمجھایا کہ ان کے آبا و اجداد میں جو لوگ رسولوں کی مخالفت پر کمر بستہ ہوئے، ان پر پروردگار کی طرف سے سزا نازل ہوئی۔

جوں جوں حضور کی دعوت عام ہوتی گئی، اس کے ساتھ ساتھ وہ لوگ بھی نمایاں ہوتے چلے گئے جنھوں نے اسلام کی مخالفت کو اپنا مشن بنالیا۔ حتیٰ کہ آخر میں صرف انھی یہودیوں اور عیسائیوں نے اسلام قبول کرنے سے انکار کیا جو قرآن مجید کے الفاظ میں خالصتاً اپنی نفسانی خواہشات، ضد اور تکبر کے اسیر بن چکے تھے۔ انھی لوگوں کے متعلق قرآن مجید نے کہا کہ ان کے دل و دماغ، آنکھوں اور کانوں پر مہر لگ چکی ہے۔ یہ مسلمانوں کے کھلم کھلا دشمن بن چکے ہیں۔ اس لیے اب مسلمانوں کو ان سے دوستی رکھنے کا کوئی جواز نہیں۔ اب مسلمانوں میں سے جو بھی ان سے دوستی رکھے گا، وہ درحقیقت منافق ہوگا۔

گویا جن آیات میں یہودیوں اور عیسائیوں سے دوستی نہ رکھنے کی ہدایت کی گئی وہ صرف ان یہودیوں اور عیسائیوں سے متعلق ہیں جن پر حضور کے ذریعے سے اتمام حجت ہو چکا تھا۔ جہاں تک عام عیسائیوں اور یہودیوں کا تعلق ہے، ان کے متعلق قرآن مجید نے مسلمانوں کو ان سے تعلق کے حوالے سے چند اصول دیے ہیں۔

پہلا اصول یہ ہے کہ تینوں توحیدی مذاہب چونکہ درحقیقت ایک ہی سرچشمے سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے ان کو ہر ممکن حد تک ایک دوسرے سے تعلقات کا رشتہ (Working relationship) رکھنا چاہیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں ہے۔ یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی بندگی نہ کریں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں اور ہم میں سے کوئی اللہ کے سوا کسی کو اپنا رب نہ بنائے۔''

(آل عمران ۳:۶۴)

اسی لیے قرآن مجید یہودیوں، عیسائیوں کی عبادت گاہوں کو بھی احترام کی نظر سے دیکھتا ہے۔ ارشاد خداوندی ہے:

''اگر اللہ (برے) لوگوں کو ایک دوسرے کے ذریعے سے دفع نہ کرتا رہے تو خانقاہیں اور گرجا، یہودیوں کی عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے، سب مسمار کر ڈالی جائیں۔'' (الحج ۲۲:۴۰)

دوسرا اصول یہ ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں میں اچھے لوگ بھی موجود ہیں۔ مسلمانوں کو ایسے لوگوں سے تعلق رکھنا چاہیے۔ ارشاد ہے:

''سارے اہل کتاب یکساں نہیں ہیں۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جو راہ راست پر قائم ہیں۔ راتوں کو اللہ کی آیات

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

پڑھتے ہیں اور اس کے آگے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ نیکی کو فروغ دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سرگرم رہتے ہیں۔ یہ صالح لوگ ہیں اور یہ جو نیکی بھی کریں گے، اس کی ناقدری نہیں کی جائے گی۔'' (آل عمران ۳: ۱۱۵)

اس مفہوم کی آیات قرآن مجید میں متعدد مقامات پر آئی ہیں۔

تیسرا اصول یہ ہے کہ بحیثیت مجموعی یہودیوں اور مشرکین کی نسبت عیسائی مسلمانوں سے دوستی میں قریب تر ہیں۔ ارشاد باری ہے:

''تم مسلمانوں سے دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنھوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان میں عبادت گزار عالم اور تارک الدنیا فقیر پائے جاتے ہیں اور ان میں غرور بالکل نہیں ہے۔'' (المائدہ ۵: ۸۲)

درج بالا اصولوں سے ہمارے لیے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مسلمان یہودی اور عیسائی اقوام سے تعلقات رکھ سکتے ہیں۔

دوستی یا تعلقات کار

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.com

بین الاقوامی تعلقات میں مستقل دوستی یا دشمنی کا کوئی تصور نہیں۔ اس کے برعکس قوموں کے ضمن میں باہمی اور مشترکہ مفادات کی بنیاد پر تعلقات کار رکھے جاتے ہیں جو بعض اوقات بہت مضبوط معاہدوں کی شکل میں بھی ظاہر ہوجاتے ہیں اور بعض اوقات مفادات کے ٹکراؤ کی وجہ سے مختلف ملک مدمقابل بھی بن جاتے ہیں۔ تاہم ہر قوم ہر وقت اپنے ہی مفادات کو بنیادی ترجیح اور اولین اہمیت دیتی ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیے۔ اگر کوئی ریاست کسی دوسری ریاست کی دوستی میں اس کے مفادات کو اپنے مفادات کی قیمت پر پورا کرنے لگے تو اس کا وجود خطرے میں پڑ جاتا ہے۔

اس ضمن میں اسلام کی ہدایت یہ ہے کہ سب سے زیادہ اہمیت اخلاقی اصولوں کو حاصل ہے۔ کسی بھی بین الاقوامی تنازع میں بنیادی اہمیت کی حامل بات یہ ہے کہ کون حق پر ہے اور کون غلطی پر ہے۔ جو حق پر ہے اس کی حمایت کرنی چاہیے اور غلطی پر اس کی مخالفت کرنی چاہیے۔ ارشاد خداوندی ہے:

''اے مسلمانو! کسی قوم کی دشمنی تمھیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم عدل وانصاف سے کام نہ لو۔ عدل کرو یہی تقویٰ کے قریب تر ہے اور اللہ سے ڈرو۔'' (المائدہ ۵: ۸)

دوسرا اصول یہ ہے کہ حتی الوسع بین الاقوامی معاہدات کے ذریعے سے اپنی ریاست کو محفوظ بنایا جائے اور پھر ان معاہدات کی روح ومعنی کے اعتبار سے پورا احترام کیا جائے۔ یہ احترام اس حد تک کیا جائے کہ اگر کسی ریاست میں مسلم اقلیت پر ظلم ڈھایا جا رہا ہو، تب بھی معاہدہ کی موجودگی میں ان کمزور مسلمانوں کی جنگی مدد جائز نہیں۔ ارشاد خداوندی ہے:

''اگر وہ (دوسری ریاستیں) صلح کی طرف جھک جائیں تو تم بھی صلح کی طرف جھک جاؤ اور بھروسا کرو اس اللہ پر جو سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے اور اگر ان کا ارادہ یہ ہو کہ تم کو دھوکا دیں تو یقیناً تمھارے لیے اللہ کافی ہے۔'' (الانفال ۸: ۶۱-۶۲)

مزید ارشاد ہے:

''اے اہل ایمان، اپنے عہد و پیمان پورے کرو۔'' (المائدہ ۵:۱)

مزید ارشاد ہے:

''اور اگر (تمھارے ریاست سے باہر کے مسلمان) تم سے دین کے معاملے میں مدد چاہیں تو تم پر ان کی مدد کرنا لازم ہے، لیکن کسی ایسی قوم کے خلاف نہیں جن سے تمھارا معاہدہ ہو۔'' (انفال ۸:۷۲)

آج مسلمانوں نے عمومی طور پر اور پاکستان نے خصوصی طور پر دوسرے ممالک کو دوستوں اور دشمنوں کے الگ الگ زمروں میں تقسیم کر دیا ہے۔ جن کو ہم دوست کہتے ہیں، ان کے مفادات پورے کرنے کے لیے اپنے مفادات کو قربان کر دیتے ہیں اور جب ہم پر کوئی سخت وقت آتا ہے تو وہ ملک اولین ترجیح اپنے مفادات کو دیتے ہیں۔ اسی طرح بعض ملکوں کی دشمنی میں ہم اس حد تک آگے چلے جاتے ہیں کہ مسلمانوں کے وسیع تر مفادات اور عدل کے تقاضے بھی نظر انداز کر دیتے ہیں۔ یہ طرز عمل صحیح نہیں ہے۔ اس کے برعکس صحیح طرز عمل یہ ہے کہ عدل کے اصولوں کو مدنظر رکھتے ہوئے اولین ترجیح اپنے تزویراتی مفادات (Strategic Interests)، اسلام کی دعوت اور بین الاقوامی معاہدات کی پاس داری کو دی جائے۔

پاکستان میں عام طور پر یقین پایا جاتا ہے کہ امریکا اسلام اور مسلمانوں کا دشمن ہے۔ یہی یقین بعض دوسرے مسلمان ممالک میں دوسری بڑی طاقتوں کے متعلق موجود ہے۔ اس بات کے حق میں بھی دلائل دیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ امریکا نے اسرائیل کی ہر جائز و ناجائز حمایت کو اپنا وطیرہ بنا لیا ہے اور اس کی مخالفت میں بھی دلائل دیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً یہ کہ امریکا کے اندر اسلام کی دعوت پر کوئی پابندی نہیں اور وہاں سب سے زیادہ پھیلنے والا مذہب اسلام ہے۔ یا یہ کہ کوسووو کے مسلمانوں کی نجات کے لیے امریکا نے یوگوسلاویہ کے خلاف ایکشن لیا۔ تاہم اس بحث سے قطع نظر اس ضمن میں قرآن مجید کی ہدایت یہ ہے کہ اگر کوئی قوم مسلمانوں سے کھلم کھلا دشمنی نہ کرے، اسلام کے راستے میں رکاوٹ نہ ڈالے اور صلح کا ہاتھ بڑھائے تو اسے دشمن قرار نہ دیا جائے، بلکہ اس سے تعلقات کار رکھے جائیں۔ ارشاد ہے:

''اللہ تمھیں اس بات سے نہیں روکتا (یعنی تمھیں اس کی ہدایت کرتا ہے) کہ تم ان لوگوں کے ساتھ نیکی اور انصاف کا برتاؤ کرو جنھوں نے دین کے معاملے میں تم سے جنگ نہیں کی ہے۔ اور تمھیں تمھارے گھروں سے نہیں نکالا۔ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اللہ تمھیں جس بات سے روکتا ہے وہ تو یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے دوستی کرو جنھوں نے تم سے دین کے معاملے میں جنگ کی ہے۔ تمھیں تمھارے گھروں سے نکالا ہے اور تمھارے اخراج میں ایک دوسرے سے مدد کی ہے۔'' (الممتحنہ: ۸۔۹)

بین الاقوامی تنازعات میں مسلمانوں سے مطلوب رویہ

اس وقت مسلمان حکومتیں کئی اندرونی و بیرونی تنازعات میں الجھی ہوئی ہیں۔ ان تمام مسائل میں مسلمانوں کا رویہ یہ ہونا

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.com

چاہیے کہ ہر معاملے کو پر امن طریقے سے، گفتگو کے ذریعے سے اور دلیل کی بنیاد پر حل کیا جائے۔ آج اس کی ضرورت جتنی مسلمانوں کو ہے اتنی اور کسی کو نہیں۔ گفتگو کے میدان میں کچھ لینے کے ساتھ ساتھ کچھ دینا بھی پڑتا ہے۔ امن کے ماحول ہی میں مسلمانوں کو اعلیٰ تعلیم کا موقع مل سکتا ہے۔ امن کے ماحول ہی میں اسلام کی دعوت تیزی سے پھیل سکتی ہے۔ امن کے ماحول ہی میں مسلمان، قرآن مجید کے اصولوں کے مطابق، اپنے اپنے معاشروں کی تعمیر کر سکتے ہیں۔ جنگ سے ہمیشہ اس فریق کو فائدہ پہنچتا ہے جو طاقت ور ہو۔ اس لیے ہمارے دشمن کی حکمت عملی یہ ہوگی کہ زیادہ سے زیادہ اشتعال دلا کر ہمیں جنگ کے میدان میں کھینچا جائے اور ہماری رہی سہی طاقت کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اس کے مقابلے میں ہماری حکمت عملی یہ ہونی چاہیے کہ ہم ہر ممکن باوقار طریقہ سے اپنے آپ کو اس سے بچائیں۔

اس کا یہ قطعاً مطلب نہیں کہ جنگ کوئی شجر ممنوعہ ہے۔ یقیناً مسلمان حکومتوں کو اسلام کی رو سے یہ حق حاصل ہے کہ وہ ظلم کے خلاف جنگ کریں۔ لیکن اس جنگ کی اجازت اس وقت ہے جب یہ معاہدوں کے مطابق ہو۔ پر امن طریقے ناکام ہو چکے ہوں اور مسلمانوں کے پاس اسلحہ اور دوسرا جنگی ساز و سامان اس قدر موجود ہو کہ جنگ کا مثبت نتیجہ نکلنے کی پوری توقع ہو۔ چنانچہ ہمارے لیے یہ ضروری ہے کہ ہر اہم موقع پر ہم بھرپور سیاسی و سفارتی کوششوں کے ذریعے سے مسائل کو حل کرنے کی کوشش کریں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

غیر مسلم ممالک میں مسلمانوں سے مطلوب رویہ

اس وقت مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد غیر مسلم ممالک میں رہ رہی ہے۔ ہر سال کئی لاکھ مسلمان حصول روزگار اور بہتر زندگی کی تلاش میں یورپ اور امریکہ کا رخ کرتے ہیں۔ چنانچہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ غیر مسلم ممالک میں مسلمانوں کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟

اس وقت دنیا میں دو واضح تبدیلیاں آئی ہیں۔ ایک یہ کہ مذہبی جبر و تشدد بہت کم ہو گیا ہے۔ اس وقت پوری دنیا میں صرف برما (میانمار) ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں سے مسلمانوں پر مذہبی جبر و تشدد کی اطلاعات آتی ہیں۔ باقی دنیا میں اگر کوئی مسائل باقی ہیں تو وہ ثانوی اور فروعی نوعیت کے ہیں، جن سے نمٹنا مشکل نہیں۔

دوسری تبدیلی یہ آئی ہے کہ دنیا کے اکثر ممالک نے حکومت چلانے کے لیے جمہوریت کو بطور ماڈل اختیار کیا ہے۔ جمہوریت میں کوئی بھی غلام نہیں ہوتا۔ ہر گروہ مناسب لابنگ اور حکمت عملی کے ذریعے سے اپنی اہمیت اور اپنے مطالبات منوانے کی جدوجہد کر سکتا ہے۔ ان دونوں خوش آئند تبدیلیوں کی وجہ سے اب مسلمانوں کے لیے یہ ممکن ہے کہ وہ غیر مسلم ملکوں میں اعتماد کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔ ایسے مسلمانوں پر دین ہی کی رو سے دو بنیادی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ایک یہ وہ ملکی قوانین کی پوری پابندی کریں گے۔ اور دوسری یہ کہ وہ وہاں اسلام کے سفیر ہوں گے۔ آج اسلام کے تمام اہم احکامات پر ہر

جگہ، ہر انسان عمل کر سکتا ہے، بشرطیکہ وہ عمل کرنا چاہے۔ صرف ایک مسئلے پر کچھ دشواری ہے اور وہ ہے طالبات کے حجاب کا مسئلہ۔ اس ضمن میں یہ بھی واضح رہے کہ سوائے سر اور چہرہ چھپانے کے باقی بدن چھپانے پر بھی کوئی اختلاف نہیں۔ خواتین کے چہرہ چھپانے کے متعلق بہت سے مسلمہ مکاتیب فکر کی یہ رائے ہے کہ یہ ضروری نہیں۔ جہاں تک سر کے بال چھپانے کا تعلق ہے اس ضمن میں بھی صورت حال یہ ہے کہ امریکا اور برطانیہ سمیت بیشتر مغربی ممالک میں اس پر بھی کوئی پابندی نہیں۔ یہ مسئلہ صرف فرانس کے اسکولوں کا ہے۔ وہاں بھی مناسب حکمت عملی کے ذریعے سے یہ حل کیا جا سکتا ہے۔ (جہاں تک خواتین کے بال چھپانے کی اسلامی حیثیت کا سوال ہے اس پر راقم نے اپنی کتاب ''اسلام اور عورت'' میں روشنی ڈالی ہے)۔

فلپائن میں مورو قبیلے کے مسلمان پچھلے تیس سال سے اپنی علیحدہ ریاست کے لیے مسلح جنگ میں مصروف ہیں۔ اگر یہی توانائیاں وہ فلپائن کے اندر اسلام کی دعوت پھیلانے پر لگاتے تو اس سے بہت مثبت نتائج حاصل ہوتے۔ اب جبکہ فلپائن جمہوریت کے راستے پر گامزن ہے، یہ ضروری ہے کہ وہاں کے مسلمان اس ملک کی تعمیر میں مثبت کردار ادا کریں۔ اور وہاں اسلام کی دعوت کے فروغ کے لیے ادارے قائم کریں۔ ان کے جتنے بھی جائز سیاسی مطالبات ہیں، انھیں پارلیمنٹ، پریس اور قانون کے ذریعے سے پر امن طور پر حل کریں۔

چین کے ایک مغربی صوبے سنکیانگ میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد بستی ہے اور انھوں نے بھی اپنی آزادی کے لیے مسلح جدوجہد شروع کی ہوئی ہے۔ یہ جدوجہد لاحاصل اور مسلمانوں کی وسیع تر مفادات کو نقصان پہنچانے والی ہے۔ چین کے اجتماعی نظام میں ایسی اچھی تبدیلیاں آگئی ہیں جن کی وجہ مسلمانوں کے لیے ترقی کرنے اور اسلام پر عمل کرنے کے راستے کھل گئے ہیں۔ ممکن ہے اس وقت انھیں اسلامی دعوت پھیلانے میں رکاوٹوں کا سامنا ہو۔ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں بھی بہتری آئے گی۔ اگر انھیں اسلام کے مطابق زندگی گزارنے میں کچھ مشکلات کا سامنا ہو تو اس ضمن میں چین کے دوست ممالک اس سے بات کر سکتے ہیں۔

روس کے اندر دس خود مختار علاقے ایسے ہیں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ روس میں آنے والی تبدیلیوں کی وجہ سے اب ان کے لیے اسلام پر عمل کرنا اور اسلامی دعوت کے لیے ادارے بنانا مشکل نہیں رہا۔ اگر وہ پر امن رہیں، قانون اپنے ہاتھ میں نہ لیں اور اداروں اور سیاسی طریقوں سے اپنی بات آگے بڑھانے کی کوشش کریں تو روز بروز ان کے مسائل کم ہوتے جائیں گے۔

بھارت کے اندر اس وقت اٹھارہ کروڑ مسلمان بستے ہیں۔ وہاں کے مسلمانوں کے لیے بھی آگے بڑھنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ وہ عدم تشدد کے ذریعے سے اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کی جدوجہد کریں۔ غیر مسلموں سے اپنے تعلقات بہتر بنائیں۔ سیاسی میدان میں صحیح حکمت عملی اختیار کریں۔ پر امن رہیں اور ہر مسئلے کو آئین و قانون اور انصاف و ضمیر کی دہائی دے کر اپنا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

موقف واضح کریں۔ اگر کسی معاملے میں وہ ظلم کا شکار ہوں تو کبھی طاقت کے ذریعے سے لینے کی کوشش نہ کریں، بلکہ مظلوم بنیں۔ اسی طرح باضمیر لوگوں کی ہمدردیاں انھیں حاصل ہو سکیں گی۔

میانمار (برما) وہ واحد ملک ہے جہاں مسلمان جبر و تشدد کا شکار ہیں۔ اس ضمن میں اسلامی لحاظ سے بنگلہ دیش اور پاکستان کی حکومتوں پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ میانمار حکومت سے سنجیدہ گفتگو کریں۔ اگر بنگلہ دیش اور پاکستان کی حکومتوں نے اس سلسلے میں حقیقی دلچسپی لی تو یقیناً حالات بہتر ہو سکتے ہیں۔ برمی مہاجرین اور صوبہ ارکان کے مسلمانوں پر بھی یہ لازم ہے کہ وہ پوری طرح پر امن رہیں۔ اور مسلح تنظیمیں بنانے کے بجائے واحد متفقہ مہاجر تنظیم بنا کر بین الاقوامی ذرائع ابلاغ، اقوام متحدہ اور خصوصاً بنگلہ دیش و پاکستان کی حکومتوں کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔

---

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com